



صَدُّ بَرِّگُ

پروین شاکر



خصوصاً شاعر ہونے تو چند "مردِ دانا" نے پروین شاکر کو اردو شاعری کا
 اختر شیرانی کہا اور یوں کیلک پرانگوں پر چڑھا کر لطفِ لذتِ مردانگی اپنے لیے مختص کیا۔
 ساری دنیا میں عورت کی شاعری کو ایک محدود طبقے اور درجے کی شاعری سمجھ کر
 دو کے درجے کے شہری کی دو کے درجے کی شاعری جاننا ایک عوامی روتیہ رہا ہے،
 مگر سیفو، اینا ایچماتوف، سلویا پلاٹھ، لی جنگ چاؤ، میراپائی، ایڈرن رچ، فرانس
 فرخ زاد اور ایریکا ژون کی شاعری نے، شعری افق پر اسلوب اور اظہارِ فن کو فوقیت
 دی۔ برصغیر میں امرتہ پرستیم، ہمیدہ ریاض اور پروین شاکر نے شاعری سے ماورائیت کو
 خارج کر کے، اپنے انداز میں اپنی بات کہنے کا حوصلہ اردو شاعری کو دیا ہے۔
 پروین شاکر نے دہرائے ہوئے جذبوں کو دہرا کر شاعری نہیں کی۔ اس نے رو کر،
 التجا کر کے اپنی مشرقیت کی لاج رکھنے کا ہنر بھی نہیں آزمایا۔ پروین شاکر نے تو ایک فرد
 کو معاشرے کی تہذیب یا فتنگی کے باوجود، حشیا نہ سزاؤں کی پستی ریت پر پا بزنہ چلنے
 پر مجبور ہوتے دیکھا ہے، مگر جذبہٴ عشق سلامت رکھتے ہوئے، اپنے حوصلے کی قندیل فردزاں
 کیے، نہ وہ دھجی دھجی جمع کرتی ہے، نہ مجرموں کو احساسِ جرم کے کچوکے دیتی ہے بلکہ یوں
 اشارے کرتی ہے کہ "جستے بہتیاں جبراً، او ہونے وڈے گراں"۔
 اردو شاعری کے گزشتہ اور آنے والے دس سال بھی، شاعرات اور
 خصوصاً پروین کے عطا کردہ اسلوب کے آئینہ دار ہوں گے۔

بِسْوَرِ اَشْيٰئِ

صدبرگ

پروین شاکر

مشائخ
مدنی
کتاب

ایک ہزار

۶۱۹۸۸

پروڈکشن : مطرب صحرائی
بشکریہ : غالب پبلشرز، لاہور

طباعت : روشنی پرنٹنگ پریس آفسیٹ ورکس برہم پوری دہلی
پروسیسنگ : ایس، آر، آفسیٹ پروسیس نیو سٹریٹ دہلی

طباعت سرورق : نیو کورپوریشن پرنٹرز دہلی
جلد ساز : یونیورسٹی بک بائڈنگ کمپنی دہلی

ناشر : شانِ ہند پبلی کیشنز

فلیٹ ۷۱ انصاری مارکیٹ

دریا گنج، نئی دہلی

امی کے نام

لیجے، اب پتہ چلا، خوشبو جب اپنے بدن میں
 ڈھلتی ہے، تو صد برگ بنتی ہے۔ پروین نے اپنے سفر کے
 ان دو مہلوں کے درمیان جو مسافت طے کی ہے، دنیائے شعر
 میں اس سے پہلے اس کا سراغ نہیں ملتا۔ یہ وہ راہیں ہیں،
 جنہیں پروین کو خود تراشنا پڑا۔ نسائیت کی روح، لڑکی سے
 عورت بنتے ہوئے، ہدیہ مشرق میں کس طرح ظہور کرے گی،
 اس کا اب تک کوئی اندازہ نہ تھا۔ سب سے بڑی بات یہ
 ہے کہ پروین کا سفر رکا نہیں، اسی لیے ہم بڑے اعتماد کے
 ساتھ مشرق کی اس عورت کو اب اپنی مکمل اور اصلی شکل میں
 دیکھنے کی آرزو کر سکتے ہیں۔ ایک وقت تھا یہ بات ناممکن نظر
 آتی تھی، پروین نے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے۔ اُس نے
 اپنے گرد پھیلے ہوئے انشار اور پھراؤ سے حسن کا جو پیکر
 تراشا ہے، وہ ایک پھول بن کر ہمارے سامنے ہے۔ صد برگ
 یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ پروین ایک عورت کی طرح
 دکھ سنا جانتی ہے۔ شاید مرد کی طرح دکھ سنا آسان ہو۔
 اسی لیے ہم نے بڑی بڑی عورتوں کو مرد بنتے دیکھا ہے۔
 تاہم اس لڑکی کو کوئی جلدی نہیں، اس لیے کہ اسے اپنے
 آپ سے باہر ہونے کی کوئی ہوس نہیں۔ وہ سچائی کے ساتھ
 وہی کھنا چاہتی ہے جو محسوس کرتی ہے۔ خدا اس کی اس
 سچائی کو زندہ رکھے۔ اس نے اپنے لیے بہت مشکل راہ اختیار
 کی ہے، میرے نبی کا قول ہے کہ خوشبو، عورت اور نماز
 میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ یہی تو وہ عورت ہے کہ زمانہ
 جس کی تلاش میں ہے اور جسے دیکھنے کی ہمیں آرزو ہے۔
 خوشبو کی شاعرہ اپنے سفر کی اس انتہا پر اس عورت کا
 ایک ادنیٰ سا روپ یا ہلکا سا عکس دکھائے، تو یہ بیویں صدی
 میں تخلیقی دنیا کا عظیم ترین کارنامہ ہوگا۔

سجاد میر

رزق ہوا۔۔۔

زندگی کے دشتِ بلا میں، سچائی جب اپنے وقتِ عصر کو پہنچ جائے، تو کون و مکان میں صرف ایک ہیکار باقی رہ جاتی ہے۔۔۔ بل من ناصر ینصرنا۔۔۔ بل من ناصر ینصرنا۔۔۔

لیکن جس معاشرے میں قدروں کے نمبر مسوخ ہو چکے ہوں اور درہم خود داری، دینارِ عزتِ نفس کوڑیوں کے بھی مول نہ نکلیں، وہاں نیکی کی نصرت کو کون آئے؟ وہاں تو ساعتیں بہری اور بھاری اندھی ہو جاتی ہیں۔۔۔ اور میرا گناہ یہ ہے کہ میں ایک ایسے قبیلے میں پیدا ہوئی جہاں سوچ رکھنا جرائم میں شامل ہے، مگر قبیلے والوں سے بھول یہ ہوئی کہ انہوں نے مجھے پیدا ہوتے ہی زمین میں نہیں گاڑا اور اب مجھے دیوار میں چن دینا ان کے لیے اخلاقی طور پر اتنا آسان نہیں رہا، مگر وہ اپنی بھول سے بے خبر نہیں، سو اب میں بھول اور ہونے کی بُجوری کا یہ اندھا کھنواں جس کے گرد گھومتے گھومتے میرے پاؤں پتھر کے ہو گئے ہیں اور آنکھیں پانی کی۔۔۔ کیونکہ میں نے اور لڑکیوں کی طرح کھوپے پہننے سے انکار کر دیا تھا اور انکار کرنے والوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوا!

ہر انکار پر میرے جسم میں ایک میخ کا اور اضافہ ہو گیا۔۔۔ مگر میں نہیں ٹھونکنے والوں نے میری آنکھوں سے کوئی تعرض نہ کیا۔۔۔ شاید وہ جانتے تھے کہ انہیں بھلانے سے میرے اندر کی روشنی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، یا پھر اپنی سفاکیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہ ایک گونگے گواہ کے طالب تھے اور میں حیران ہوں کہ اس مسلسل گواہی سے میری آنکھیں اب تک پتھرائی کیوں نہیں!

سنگینوں میں پروئے ہوئے بچے اور نیروں پہ سجے ہوئے جوان سز میری نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہے۔۔۔ اور میں قتل ہونے والوں کے نام تک نہیں پوچھ سکی۔۔۔ کہ ایسا کرنے میں دفا داریاں مشکوک ہو جاتی ہیں، مرگِ انبوہ تو یوں بھی جشنِ کاساں رکھتی ہے۔۔۔ سو تماشا دیکھنے والوں میں میری آنکھیں بھی شامل رہیں!

بستی میں برفباری ہوئی، تو لوگوں نے ہاتھ تاپنے کے لیے گھری جلد دیے اور جب تمام بستی شعلوں۔

کی پیٹ میں آگنی، تو سائے ہاتھ بلند تھے، مگر کسی کو سوزہ ابراہیم یاد نہ تھی !
 بہار کی دُھوپ جب شہر کا رنگ جلانے لگے، تو سورج سے حرارت کی بجائے پناہ مانگی جاتی ہے
 لیکن بارشیں جو میں، تو کھلا کہ اپنے شہر کا رنگ ہی کچا تھا !

اور رہا شہر جاں، تو سُرخ انگور سے مٹھی ہوئی سرد ہوانے جس کی گلیوں میں گلابی اُچھال دی تھی بہار
 کی پہلی بارشوں نے جسے اس طرح چوما تھا کہ زندگی سبز روشنی میں نہا گئی تھی، بادِ شمال نے جُھوم کئے موسم
 کے قن میں کیسے رگ تاک کھول دی اور محبت کی ادک سے زندگی کو خوشبو پلا رہی تھی، جہاں وجود کی بے ہنر
 جڑوں تک نم کی شبینم کچھ اس طرح اتر گئی تھی کہ بے برگ و بے ثمر شجر پھولوں کے بوجھ سے جھک جھک
 گئے، جہاں وجود کے سردی دُھند کے میں آب و آتش کچھ یوں بہم جوئے کہ ہوانے مٹی کے آگے سر جھکایا
 اور قدموں کے نیچے تاروں کی طرح بچی ہوئی رات ساتی سے کچھ یوں بل گئی کہ سپردگی کا نشہ تا عمر ٹوٹنا نظر
 نہیں آتا تھا

مگر جب زندگی کے میلے میں رقص کی گھڑی آئی، تو سنڈریلا کی جوتیاں ہی غائب تھیں، نہ وہ خواب
 تھا، نہ وہ باغ تھا، نہ وہ شہزادہ، لپٹے رنگوں کی سب پریاں اپنے طلسمی دیس کو اڑ چکی تھیں اور لوہمان پھیلوں
 سے آنکھوں کو کھٹی شہزادی جنگل میں اکیلی رہ گئی۔ اور جنگل کی شام کبھی تنہا نہیں آتی! بیٹریے اس کے
 خاص دوست ہوتے ہیں! شہزادی کے پاس بچاؤ کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ اُسے ایک
 ہزار راتوں تک کہانی کہنی ہے اور ابھی تو صرف ۲۰ راتیں ہی گزری ہیں!

مادر زاد مناتھوں کی بستی میں زیت کرنے کا اور کوئی ہنر نہیں۔ اور ہوا سے بڑھ کر اور کون منافع
 ہو گا کہ جو صبح سویرے پھول کو جُوم کر جگاتی بھی ہے اور شام ڈھلے اپنے حریص ناخونوں سے اُس کی پنکھڑیاں بھی
 نوجی لیتی ہے۔ قیمتِ شگفت چکانے میں جاں کا زیاں تو ایسی کوئی بات نہیں، مگر یہ پنکھڑی پنکھڑی
 ہو کر در بدر پھر نالیقینا دکھ دیتا ہے۔ ہوا کا کوئی گھر نہیں، سو وہ کسی سر پر چھت نہیں دیکھ سکتی!

مختص اندھیوں سے فسوب نہ سہی، مگر ہوا کے ہوتے ہوئے، ثمر کا شجر سے ربط رہنا بھی
 محال ہے۔ لیکن شجر کتنا ہی دیران کہیں نہ ہو، امید بہار پیوستہ ہے، پھول کتنا ہی پامال کیوں
 نہ ہو، اپنے دنوں پر یقین کرنے والے کوئی نہ کوئی شگون لے ہی لیتے ہیں۔ صد برگ بھی تمام تر ریزہ ریزہ
 ہونے کے باوصف اسی یقین پر مہر اثبات ہے۔ اور اس یقین کی کوئی نشی سی کرن آپ کے
 دل تک بھی اتر سکے، تو میں سمجھوں گی کہ میرے وجود کی ایک اور پنکھڑی رزق ہوا ہونے سے نکلی گئی!

پر دین شکر

جنوری ۲۰۱۹ء

جلا دیا شجرِ جاں کہ سبز بخت نہ تھا
کسی بھی رُت میں ہر اہو یہ وہ درخت نہ تھا

جو خواب دیکھا تھا شہزادیوں نے پھیلے پہر
پھر اُس کے بعد مقدر میں تاج و تخت نہ تھا

ذرا سے جبر سے میں بھی تو ٹوٹ سکتی تھی
مری طرح سے طبیعت کا وہ بھی سخت نہ تھا

مے لیے تو وہ خنجر بھی پھول بن کے اٹھا
زبان سخت تھی، لہجہ کبھی کرخت نہ تھا

اندھیری راتوں کے تنہا مسافروں کے لیے
دیا جلاتا ہوا کوئی ساز و رخت نہ تھا

گتے وہ دن کہ مجھی تک تھا میرا دکھ محدود
خبر کے جیسا یہ افسانہ لخت لخت نہ بھتا

مرہبی جاؤں تو کہاں لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے

لوگ تھرا گئے جس وقت منادی آئی
آج پیغمبر نیا طسّل الہی دیں گے

جھونکے کچھ ایسے تھپکتے ہیں گلوں کے رخسار
جیسے اس بار تو پیت جھڑ سے بچا ہی دیں گے

ہم وہ شب زاد کہ سوچ کی عنایات میں بھی
اپنے بچوں کو فقط کورنگا ہی دیں گے

آستیں سانپوں کی پھینیں گے گلے میں مالا
اہل کوفہ کو نسی شہر پناہ ہی دیں گے

شہر کی چابیاں اعدا کے حوالے کر کے
تحفتاً پھر انھیں مقتول سپاہی دیں گے

تمام لوگ اکیلے تھے، راہبسر ہی نہ تھا
 پچھڑنے والوں میں اک میرا ہم سفر ہی نہ تھا

برہنہ شاخوں کا جنگل گڑا تھا آنکھوں میں
 وہ رات تھی کہ کہیں چاند کا گزر ہی نہ تھا

تمہارے شہر کی ہر چچاؤں مہسرباں تھی مگر
 جہاں پہ دھوپ کڑی تھی، وہاں شجر ہی نہ تھا

سیمٹ لیتی شکستہ گلاب کی خوشبو
 ہوا کے ہاتھ میں ایسا کوئی ہنسر ہی نہ تھا

میں اتنے ساپنوں کو رستے میں دیکھ آئی تھی
 کترے شہر میں پہنچی تو کوئی ڈر ہی نہ بھتا

کہاں سے آتی کرن زندگی کے زنداں میں
وہ گھر ملا تھا مجھے جس میں کوئی درہی نہ تھا

بدن میں پھیل گیا سرخ بیل کی مانند
وہ زخم سوکھتا کیا، جس کا چارہ گرہی نہ تھا

ہوا کے لائے ہوئے بیج پھر ہوا کو گئے
رکھے تھے پھول کچھ ایسے کہ جن میں زرہی نہ تھا

قدم تو ریت پہ حاصل نے بھی نہ رکھنے دیا
بدن کو جکڑے ہوئے صرف اک بھنوبہی نہ تھا

کسی کی کھوج میں پھر کھو گیا کون
گلی میں روتے روتے سو گیا کون

بڑی مدت سے تنہا تھے مرے دکھ
خدایا، میرے آنسو رو گیا کون

جلا آئی تھی میں تو آستیں تک
لہو سے میرا دامن دھو گیا کون

جدھر دیکھوں کھڑی ہے فصلِ گریہ
مرے شہروں میں آنسو بو گیا کون

ابھی تک بجائیوں میں دشمنی تھی
یہ ماں کے خوں کا پیاسا ہو گیا کون

سندر، کومل سپنوں کی بارات گزر گئی جانان!
دھوپ آنکھوں تک پہنچی ہے ات گزر گئی جانان!

بھور سمے تک جس نے ہمیں باہم اُجھلتے رکھا
وہ ابیلی ریشم ایسی بات گزر گئی جانان!

سدا کی دیکھی رات ہمیں اس بار ملی تو چکی سے
خالی مات پر رکھ کے کیا سوغات گزر گئی جانان!

کس کو نپل کی آس میں اب تک بیسے ہی سر سبز تو
اب تو دھوپ کا موسم ہے بارات گزر گئی جانان!

لوگ نجانے کن راتوں کی مرادیں مانگا کرتے ہیں
اپنی رات تو وہ جو تیرے سات گزر گئی جاناں!

اب تو فقط صیادا کی فلداری کا بہانہ ہے ورنہ
ہم کو دام میں لانے والی رکھات گزر گئی جاناں!

آنکھوں میں تھکن، دھنک بدن پر
جیسے شبِ اولیں دلہن پر

دستک ہے سوائے شب کی تن پر
کھلتا ہے نیا درجہ فن پر

رنگوں کی جمیل بارشوں میں
اُترتی ہے بہا رچھول بن پر

تھامے بوٹے ہاتھ روشنی کا
رکھ آئی قدم زمیں گلن پر

گزر اٹھا کوئی شیر پر جھونکا
سلوٹ ہے قبائے یاسمن پر

شبنم کے لبوں پہ ناچتی ہے
چھایا ہے عجب نشہ کرن پر

کھلتی نہیں برگ و گل کی آنکھیں
جادو کوئی کر گیا چمن پر

خاموشی کلام کر رہی ہے
جذبات کی مہر ہے سخن پر!

وصال

نخارِ لذت سے ایک پل کو
جو آنکھیں چونکیں ،

تو نیم خوابیدہ سرخوشی میں
غرورِ تارا جگی نے سوچا
خدا سے برتر کے قہر سے

آدم اور حوا

بہشت سے جب بھی نکلے ہوں گے
سپردگی کی اسی جیس انتہا پہ ہوں گے
اسی طرح

ہم بدن اور ہم خواب و ہم تمنا

بچ رہا تھا اک پرندہ ڈال پر ہفتا ہوا
جال وہ پھینکے ہوانے، وہ بھی پر بستہ ہوا

دے کے مجھ کو اذن گہرے پانیوں کی سیر کا
خود روانہ ہے وہ میری رستیاں کتا ہوا

شہر کی ہر رگ ریز پر برفن خیمہ زن ہوئی
بند اگلے چاند تک اب دھوپ کا رستہ ہوا

جو ہوا آئی، مرے چہرے پہ پاؤں رکھ گئی
ادبچی شاخوں کا شگوفہ برگِ نورستہ ہوا

ریت پر لکھا گیا یا سطح موج آب پر
نام جو اس آنکھ کی وحشت سے وابستہ ہوا

بختِ رسوائی کہ کوئی اپنی نطنروں میں گرا
اور کوئی مضر کے بازار میں سستا ہوا

چاند کا پتھر سام دھندلا تھا نہ چہرہ حرف کا
شہر کے سارے دریچوں پر ہے پردہ برف کا

یہ ہوا کی سرد مہری تھی کہ میرے دل کا خوف
جم گیا ہے ہونٹ پر آ کر تنفس حرف کا

دیکھ کر قاتل کے بچے درگزر کرتا قصاص
کون تھا مقتول کے پیادوں میں اتنے ظرف کا

ایک وہ موسم کہ مجھ پر مسکراہٹ جبر تھی
اور اب موقع نہیں ملتا ہنسی کے صرف کا

ہاتھ بھی جھلے بدن بھی بے اماں ہو کر رہا
چھوڑ کر مٹی، بنایا جب گھر وندہ برف کا

بج اٹھے ہوا کے دف، وحب میں کلی آئی
زندگی کے میلے میں رقص کی گھڑی آئی

میں بھی کتنی بھولی تھی، ایک لطفِ مبہم پر
رقص گہ میں گر گابی چھوڑ کر چلی آئی

چشم و دل کے سب آنسو اس ہوا میں کھل اٹھے
شاخسارِ مژگاں پر رتِ گلاب کی آئی

شہر کے شگوفوں کے نیم رس سے اکتا کر
تازگی سے ملنے کو بن میں تیرتی آئی

اس سے قبل بھی سائے کب قریب آئے تھے
اس نئے سفر میں بھی کام دھوپ ہی آئی

دھوپ سات رنگوں میں پھیلتی ہے آنکھوں پر
 برف جب پگھلتی ہے اس کی نرم پلکوں پر

پھر بہار کے ساتھی آگے ٹھکانوں پر
 سرخ سرخ گھرنکلے سبز سبز شاخوں پر

جسم و جاں سے اترے گی گرد پھلے موسم کی
 دھولہ ہی ہیں سب چڑیاں اپنے پنکھ چشموں پر

ساری رات سوتے ہیں مسکرا رہا تھا وہ
 جیسے کوئی سپنا سا کانپتا تھا ہونٹوں پر

تتلیاں پکڑنے میں دور تک نکل جانا
گمنا اچھا لگتا ہے پھول جیسے بچوں پر

لہر لہر کرنوں کو چھیڑ کر گزرتی ہے
چاندنی اُترتی ہے جب شہزاد جھرنوں پر

پھول سو بھی جائیں تو روشنی نہیں بھبتی
سبز دُوب کی آنکھیں جاگتی ہیں رستوں پر

بس اے بہار کے سورج! بڑھا یہ قہر کا رنگ
جلا گئی ہے تری دھوپ میرے شہر کا رنگ

شجر کو سبز قبلا دیکھ کر یہ اُلجھن ہے
کہاں پہ رنگِ نمو ہے کہاں پہ زہر کا رنگ

کنارِ جوئے رواں جب سے قتل گاہ بنی!
ہجوم اُٹنے لگا دیکھنے کو نہر کا رنگ

ابھی تو میں نے سمندر میں ناؤ ڈالی تھی
یہ کیا ہوا کہ بدلنے لگا ہے لہر کا رنگ

یہ احتجاج بجا ہے کہ تیسری بارش
یہ ماننا ہے کہ کچا تھا اپنے شہر کا رنگ

گلہ ہی کیا ہے اگر وہ بھی سبز چشم ہوا
طبیعتوں پہ تو چڑھتا رہا ہے دہر کا رنگ

وہ آج بھی مجھے سوتے میں ڈسنے آئے گا
وہ حانا ہے کہ کھلتا ہے مجھ پہ زہر کا رنگ

اُترنے پائے کا قوس قزح کا تھام کے ہاتھ
سوادِ حرف میں کب عشق بے پہر کا رنگ

امیر شہر سے سائل بڑا ہے
 بہت نادار لیکن دل بڑا ہے

لہو جھنے سے پہلے خوں بہا دے
 یہاں انصاف سے قاتل بڑا ہے

چٹانوں میں گھرا ہے اور چپ ہے
 سمندر سے کہیں ساحل بڑا ہے

کسی بستی میں ہوگی سچ کی حرمت
 ہمارے شہر میں باطل بڑا ہے

جو نفل اللہ پر ایمان لائے

وہی داناؤں میں عاقل بڑا ہے

اُسے کھو کر بہائے درد پائی

زیاں چھوٹا تھا اور حاصل بڑا ہے

پرودیے مرے آنسو ہوانے شاخوں میں
بھرم بہا رکا باقی رہے نگاہوں میں

صبا تو کیا کہ مجھے دھوپ تک جگانہ سکی
کہاں کی عیند اتر آئی ہے ان آنکھوں میں

کچھ اتنی تیز ہے سرخی کہ دل دھڑکتا ہے
کچھ اور رنگ پس رنگ ہے گلابوں میں

سپردگی کا نشہ ٹوٹنے نہیں پاتا
انا سمانی ہوئی ہے دف کی باہوں میں

بدن پہ گرتی چلی جا رہی ہے خواب سی برف
خک پیدہی گھلی جا رہی ہے سانسوں میں

شام آئی، تری یادوں کے ستارے نکلے
رنگ ہی غم کے نہیں، نقش بھی پیارے نکلے

ایک موہوم تمنا کے سہارے نکلے
چاند کے ساتھ تھے بجر کے ماٹے نکلے

کوئی موسم ہو مگر شانِ حشم و پیچ و ہی
رات کی طرح کوئی زلف سنوارے نکلے

رقص جن کا ہمیں ساحل سے بہا لایا تھا
وہ بھنور آنکھ تک آئے تو کنارے نکلے

وہ تو جاں لے کے بھی ویسا ہی سبک نام رہا
عشق کے باب میں سب جرم ہمارے نکلے

عشق دریا ہے جو تیرے وہ تھی دست ہے
وہ جو ڈوبے تھے، کسی اور کنارے نکلے

دھوپ کی رت میں کوئی چھاؤں اگاتا کیسے
شاخ پھوٹی تھی کہ ہمسایوں میں آسے نکلے

پا بہ گل سب ہیں، رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بستہ شہر میں کھولے مری زنجیر کون

میرا سر حاضر ہے لیکن میرا منصف دیکھ لے
کر رہا ہے میری فردِ جسم کو تحسیر کون

آج دروازوں پہ دستک جانی پہچانی سی ہے
آج میرے نام لاتا ہے مری تعزیر کون

کوئی مقتل کو گیا تھا مدتوں پہلے مگر
ہے درخیمہ پہ اب تک صورتِ تصویر کون

میری چادر تو چھنی تھی کشام کی تنہائی میں
بے روائی کو مری پھر دے گیا تشہیر کون

سچ جہاں پابستہ، ملزم کے کھڑے ہیں ملے
اُس عدالت میں سنے گا عدل کی تفسیر کون

یغند جب خوابوں سے پیاری ہو تو ایسے عہد میں
خواب دیکھے کون اور خوابوں کو دے تعبیر کون

ریت ابھی پچھلے مکانوں کی نہ واپس آئی تھی
پھر لب ساحل گھر و نذا کر گیا تعمیر کون

سارے رشتے ہجرتوں میں ساتھ دیتے ہیں تو پھر
شہر سے جاتے ہوئے ہوتا ہے دامن گیر کون

دشمنوں کے ساتھ میرے دوست بھی آزاد ہیں
دیکھنا ہے، کھینچتا ہے مجھ پہ پہلا تیر کون

مشکل ہے کہ اب شہر میں نکلے کوئی گھر سے
دستار پہ بات آگئی ہوتی ہوئی سر سے

برسا بھی تو کس دشت کے بے فیض بدن پر
اک عمر مرے کھیت تھے جس ابر کو تر سے

اس بار جو ایندھن کے لیے کٹ کے گرا ہے
چڑھوں کو بڑا پیار تھا اس بوڑھے شجر سے

محنت مری آندھی سے تو منسوب نہیں تھی
رہنا تھا کوئی ربط شجر کا بھی تر سے

خود اپنے سے ملنے کا تو یارا نہ تھا مجھ میں
 میں بھیڑ میں گم ہو گئی، تنہائی کے ڈر سے

بے نام مسافت ہی مقدر ہے تو کیسا غم
 منزل کا تعین کبھی ہوتا ہے سفر سے

پتھر ایا ہے دل یوں کہ کوئی اسم پڑھا جائے
 یہ شہر نکلتا نہیں جادو کے اثر سے

نکلے ہیں تو رستے میں کہیں شام بھی ہوگی
 سورج بھی مگر آئے گا اس راہ گزر سے

اپنی تنہائی مرے نام پہ آباد کرے
کون ہوگا جو مجھے اُس کی طرح یاد کرے

دلِ عجب شہر کہ جس پر بھی کھلا در اُس کا
وہ مسافر اسے ہر سمت سے برباد کرے

اپنے قاتل کی ذہانت سے پریشان ہوں میں
روز اک موت نئے طرز کی ایجاد کرے

اتنا حیراں ہو مری بے طبعی کے آگے
واقف میں کوئی در خود مرا صیاد کرے

سلبِ بیانی کے احکام ملے ہیں جو کبھی
 روشنی چھونے کی خواہش کوئی شبِ ادرکے

سوچ رکھنا بھی جرائم میں ہے شامل اب تو
 وہی معصوم ہے ہر بات پہ جو صاد کرے

جب لہو بول پڑے اُس کے گواہوں کے خلاف
 قاضی شہر کچھ اس باب میں ارشاد کرے

اُس کی مہٹی میں بہت روز رہا میرا وجود
 میرے ساحر سے کہو، اب مجھے آزاد کرے

ہجر کی شب کا کسی اسم سے کٹنا مشکل
چاند پورا ہے تو پھر درد کا کھٹن مشکل

موجہ خواب ہے وہ اُس کے ٹھکانے معلوم
اب کیا ہے تو یہ سمجھو کہ پلٹنا مشکل

جن درختوں کی جڑیں دل میں اتر جاتی ہیں
اُن کا آندھی کی درانتی سے بھی کٹنا مشکل

قوتِ غم ہے جو اس طرح بنھالے ہے مجھے
ورنہ بکھروں کسی لمحے تو سمٹن مشکل

اُس سے ملنے ہوئے چہرے بھی بہت ہونے لگے
شہر کے شہر سے اک ساتھ نمٹنا مشکل

اب کے بھی خوشیوں پہ کچھ نام تھے پہلے سے لکھے
اب کے بھی فصل کا دہقانوں میں بننا مشکل

شکستہ پائی ارا۔ دل کے پیش و پس میں نہیں
دل اُس کی چاہ میں گم ہے جو میرے بس میں نہیں

براہِ روزنِ زنداں ہوا تو آتی تھی
کھلی فضا میں گھٹن وہ ہے جو قفس میں نہیں

قبائے جاں جسے چھوتے ہی چمپئی ہو جائے
وہ شعلگی کسی فصلِ حنا نفس میں نہیں

کسی وصالِ خیرِ رست کی مہرباں آمد
ہمیں قبول — مگر بجر کے برس میں نہیں

عجیب خواب تھا آنکھیں ہی لے گیا میری
 کرن کا عکس بھی اب میری دسترس میں نہیں
 دلوں کا حال تو بین السطور لکھتے ہیں
 کلیدِ حرف کتابوں کے پیش رس میں نہیں

رستہ بھی کٹھن، دھوپ میں شدت بھی بہت تھی
سائے سے مگر اس کو محبت بھی بہت تھی

نیچے نہ کوئی میرے مسافر کے جلائے
زخمی تھا بہت پاؤں، مسافت بھی بہت تھی

سب دوست مرے منظر پر وہ شب تھے
دن میں تو سفر کرنے میں دقت بھی بہت تھی

بارش کی دعاؤں میں نمی آنکھ کی مل جائے
جذبے کی کبھی اتنی رفاقت بھی بہت تھی

کچھ تو ترے موسم ہی مجھے راس کم آئے
اور کچھ مری مٹی میں بغاوت بھی بہت تھی

پھولوں کا بکھرنا تو مستدرہ ہی تھا لیکن
کچھ اس میں ہواؤں کی سیاست بھی بہت تھی

وہ بھی سرِ مقل ہے کہ سچ جس کا تھا شاہد
اور واقفِ احوال عدالت بھی بہت تھی

اس ترکِ رفاقت پر پریشاں تو ہوں لیکن
اب تک کے ترے ساتھ یہ حیرت بھی بہت تھی

خوش آئے تجھے شہرِ منافی کی امیری
ہم لوگوں کو سچ کہنے کی عادت بھی بہت تھی

جتنا ہو فرزوں، عطاءے رب ہے

تخلیق کا کرب بھی عجب ہے

اس خواب کی لو کو مت بھجانا

یہ میرا چہرہ رخ نیم شب ہے

سورج نے کبھی تو سوچا ہوتا

کیا میرے زوال کا سبب ہے

کب اُس کے وصال میں ہوا تھا

وہ حال جو تیرے دل کا اب ہے

ملنے کا تو مسئلہ نہیں ہے
 پہچان بھی پائے، بات تب ہے
 خود ڈھونڈ رہا ہے اب حیواں
 اور پیچھے قبیلہ جاں بلب ہے

بچھڑا ہے جو اک بار قوتے نہیں دیکھا
اس زخم کو ہم نے کبھی سلتے نہیں دیکھا

اک بار جسے چاٹ گئی دھوپ کی خواہش
پھر شاخ پہ اس پھول کو کھلتے نہیں دیکھا

یک نخت گرا ہے تو جڑیں تک نکل آئیں
جس پیر کو اندھی میں بھی رٹتے نہیں دیکھا

کانٹوں میں گھرے پھول کو چوم آئے گی لیکن
تنہا کے پروں کو کبھی چھلتے نہیں دیکھا

کس طرح مری روح ہری کر گیا آخر
وہ زہر جسے جسم میں کھلتے نہیں دیکھا

تجربے تو کوئی گلہ نہیں ہے
 قسمت میں مریٰ صلہ نہیں ہے

پچھڑے تو بنجانے حال کیا ہو
 جو شخص ابھی ملا نہیں ہے

جینے کی تو آرزو ہی کب بھتی
 مرنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے

جو زلیست کو معتبر بناوے
 ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہے

خوشبو کا حساب ہو چکا ہے

اور پھول ابھی کھلا نہیں ہے

سرشاری رہبری میں دیکھا

پیچھے مراقبہ نہیں ہے

اک ٹھیس پہ دل کا پھوٹ بہنا

چھوٹنے میں تو آبلہ نہیں ہے!

بدن تک موجِ خواب آنے کو ہے پھر
یہ بستی زیرِ آب آنے کو ہے پھر

ہری ہونے لگی ہے شاخِ گریہ
سہرِ مژگاں گلاب آنے کو ہے پھر

اچانک ریتِ سونا بن گئی ہے
کہیں آگے سراب آنے کو ہے پھر

زمیں انکار کے نشے میں گم ہے
فلک سے اک عذاب آنے کو ہے پھر

بشارت دے کوئی تو آسماں سے
کہ اک تازہ کتاب آنے کو ہے پھر

ورتیچے میں نے بھی وا کر لیے ہیں
کہیں وہ ماہتاب آنے کو ہے پھر

جہاں حرف تعلق ہو اُستانی
مجھت میں وہ باب آنے کو ہے پھر

گھروں پر جبرچہ ہوگی سفیدی
کوئی عزت مآب آنے کو ہے پھر

فصیلِ شہر پر تھی ضربِ کاری
کماں داروں کا شوقِ شہسپاری

کہاں فنِ کار کو مر کے بھی حاصل
عذابِ زندگی سے رستگاری

ہجومِ رنگ میں بھی دل کا مسلک
کسی عہدِ وفا کی پاسداری

اُسی چہرے سے اوروں کی پرکھ ہے
ابھی تک ہے وہی اک شکلِ پیاری

وہ جب خود ٹوٹنے والا ہوا تھا
میں ہاری بھی تو کیسے وقت ہاری!

زیں ماں کی طرح ہے، ہر ستم پر
بس اک حرفِ دعا ہونٹوں سے جاری

— ق —

کسی سمیاری کی بیعت میں روشن
ہماری گردنوں پر سرخ دھاری

اسیرِ کربلا جب یاد آئیں
کہاں لگتی ہے پھر زنجیر بھاری

سنگ بگھل بھی جاتے ہیں
 جادو چل بھی جاتے ہیں

دیر تک غم رہنے سے
 آنچل گل بھی جاتے ہیں

دو روپہ پیرٹوں کے بیچ
 رستے چل بھی جاتے ہیں

صرف ہوا پر کیوں تعزیر
 پھول مسل بھی جاتے ہیں

بس تریاق نہ کھوج کے بیٹھ
سانپ نکل بھی جاتے ہیں

طاؤسی یادوں کے دکھ
زخم کو جھل بھی جاتے ہیں

دیکھ اپنی شادابی کو
آنسو پھیل بھی جاتے ہیں

دریا پار یہ سوچ کے چل
گھرے بدل بھی جاتے ہیں

خزاں کی رُست میں لمحہ جمال کیسے آگیا
یہ آج پھر سنگھار کا خیال کیسے آگیا

ہنسی کو اپنی سُن کے ایک بار میں بھی چونک اٹھی
یہ مجھ میں دکھ چھپانے کا کمال کیسے آگیا

وہ رسم چارہ سازی جنوں تو ختم ہو چکی
یہ دل کے نام حرفِ اندمال کیسے آگیا

ابھی تو دھوپ نوزنِ قفس سے کوسوں دور تھی
ابھی سے آفتاب کو زوال کیسے آگیا

جدائیوں کے زخم تو، سنا کہ بھر چلے تھے پھر
بدن کے ماتھے ناخن وصال کیسے آگیا

تمام کائنات ازل سے آئینوں کی زد یہ تھی
ہجوم عکس میں یہ بے مثال کیسے آگیا

گھر کی یاد ہے اور درپیش سفر بھی ہے
چوتھی سمت نکل جانے کا ڈر بھی ہے

لمحہ رخصت کے گونگے سناٹے کی
ایک گواہ تو اُس کی چشم تر بھی ہے

عشق کو خود در یوزہ گرمی منظور نہیں
مانگنے پر آئے تو کاسہ سر بھی ہے

نئے سفر پہ چلتے ہوئے یہ دھیان ہے
رستے میں دیوار سے پہلے در بھی ہے

جن چیزوں کے ہر ارہنے کی دعا کی تھی
اُن میں آج سے شاملِ زخمِ ہمز بھی ہے

بہت سے ناموں کو اپنے سینے میں چھپائے
جلی ہوئی بستی میں ایک شجر بھی ہے

وہی خیال کہ آنکھوں تک رہ جائے تو اٹک
مصرعہ تر بن جاتے تو سلکِ گہر بھی ہے

سو کھ گیا خود اپنے دل کی نرمی سے
پیڑ کو کیا معلوم تھا، بیل امر بھی ہے

عزائی شوق کی وحشت عجب تھی
کسی خوش چشم سے نسبت عجب تھی

بجھوم چشم و رخسار و دہن میں
جو تہس کر گئی صورت عجب تھی

وہ تری دید و فک تو کر رہا تھا
مگر اس شخص کی حالت عجب تھی

مری تقدیر کی نیرنگیوں میں
مری تدبیر کی شرکت عجب تھی

سرِ مقتل کسی کے پیرہن میں
گلابی رنگ کی حدت عجب تھی

بدن کا پہلے پہلے آگ چکھنا
رگ و پے میں کوئی لذت عجب تھی

اُسی طرح سے ہر اک زحمتِ خوشنما دیکھے
وہ آئے تو مجھے اب بھی ہرا بھرا دیکھے

گزر گئے ہیں بہت دن رفاقتِ شب میں
اک عمر ہو گئی چہرہ وہ چاند سا دیکھے

مے سکوت سے جس کو گلے رہے کیا کیا
پچھرتے وقت ان آنکھوں کا بولنا دیکھے

ترے سوا بھی کئی رنگِ خوش نظر تھے مگر
جو تجھ کو دیکھ چکا ہو وہ اور کہا دیکھے

بس ایک ریت کا ذرہ بچا ہوتا آنکھوں میں
ابھی تک جو مسافر کا راستہ دیکھے

اُسی سے پوچھے کوئی دشت کی رفاقت۔ جو
جب آنکھ کھولے پہاڑوں کا سلسلہ دیکھے

تجھے عزیز تھا اور میں نے اُس کو جیت لیا
میری طرف بھی تو اک پل ترا حنا دیکھے

موجیں بہم ہوتیں تو کسارہ نہیں رہا
آنکھوں میں کوئی خواب دوبارہ نہیں رہا

گھرنیچ گیا کہ دور تھے کچھ صاعقتہ مزاج
کچھ آسمان کا بھی اشارہ نہیں رہا

بھولا ہے کون ایڑ لگا کر جیاست کو
رکنا ہی بخش جاں کو گوارا نہیں رہا

جب تک وہ بے نشان رہا، دسترس میں تھا
خوش نام ہو گیا تڑسا را نہیں رہا

گم گشتہ سفر کو جب اپنی خبر ملی
رستہ دکھانے والا ستارہ نہیں ہوا

کیسی گھڑی میں ترکِ سفر کا خیال ہے
جب ہم میں لوٹ آنے کا یارا نہیں ہوا!

ہاں۔ ابھی دُعائے نور پڑھی جاسکتی ہے

ہاں۔ ابھی دُعائے نور پڑھی جاسکتی ہے ،
 روڈ بلاک کے اسم ابھی تک اپنی تاثیروں سے منافق نہیں مٹے

حرفِ دعائیں آس کی کوتاہ بندہ ہے !

ٹوٹنے والی سانسوں کا اک تار

کسی اُن دیکھے مسیحا کے ہاتھوں میں جھول رہا ہے ،

دو دشمن دنیاؤں کے مابین زمینِ بے ملکیت کی حد پر

کوئی خزانوں جیسا ذہن

رہ رہ کے کچھ جھول رہا ہے

آنکھوں پر اس لمحہ آخر کی سیال روپہلی جھٹی چڑھنے لگی ہے
جس کو چھونے سے سورج کے ہاتھ بھی
برف کے ہو جائیں گے

آنے والوں کی صورت کجلانے لگی ہے
پھر بھی آنکھیں ہیں کہ دروازے سے لگی ہیں!
کوئی نجات دہندہ — شافع روز قیامت
کوئی سب باتوں کا جاننے والا — میرے علیم و خبیر
کوئی معجزے والا ہاتھ — اے موسیٰ کے خدا
کوئی جلانے والی سانس — اے رب عیسیٰ
کوئی محبت والی آنکھ — اے محبوب محمدؐ!

زمین پر پاؤں تھتے، قیام آسمان میں کھتا
 مری طرح سے وہ شخص بھی امتحان میں تھا

یہ روشنی تھی کہ اُس کا چہرہ دھیان میں تھا
 ستارہ سا اک چراغ میرے مکان میں تھا

کہ چاند خود آ کے ایک تارے کا نام پوچھے
 ہجوم سیارگان! یہ کس کے گمان میں سمجھتا

میں اس کی آنکھوں کو دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں
نظر کا ایسا ظلم کس داستان میں تھا

میں اس کی کشتی سے اپنا آنچل ہٹا کے سمجھی
سفر کا بھی حوصلہ فقط بادباراں بہتا

دعا کبھی میں نے مانگی تھی دونوں وقت ملتے
یہ زندگی بھر کا جھپٹا کب دھیان میں تھا

جدائی کا فیصلہ تو پھر بھی ہمارا ہوتا
یہ مان بھی لیں اگر کوئی درمیان میں تھا

قدموں میں بھی تکان تھی، گھر بھی قریب تھا
پر کیا کریں کہ اب کے سفر ہی عجیب تھا

نکلے اگر تو چاند درتپچے میں رُک بھی جائے
اس شہر بے چراغ میں کس کا نصیب تھا

آمدھی نے اُن رُتوں کو بھی بے تاج کر دیا
جن کا کبھی ہوا سا پرندہ نقیب تھا

کچھ اپنے آپ سے ہی اُسے کشمکش نہ تھی
مجھ میں بھی کوئی شخص اُسی کا رقیب تھا

پوچھا کسی نے مول تو تیسرا ان رہ گیا
اپنی نگاہ میں کوئی کتنا غریب تھا

مقتل سے آنے والی ہوا کو بھی کب ملا
ایسا کوئی دریچہ کہ جو بے صلیب تھا

بھی گناہ دھل گئے، سزا ہی اور ہو گئی
مرنے وجود پر تری گواہی اور ہو گئی

رفو گرانِ شہر بھی کمال لوگ تھے مگر
ستارہ ساز ہاتھ میں قبا ہی اور ہو گئی

بہت سے لوگ شام تک کوار کھول کر رہے
فقیر شہسکی مگر صد اسی اور ہو گئی

اندھیرے میں تھے جب تک زمانہ سازگار تھا
چراغ کیا جلا دیا، ہوا ہی اور ہو گئی

بہت سنبھل کے چلنے والی تھی پر اب کے بار تو
وہ گل کھلے کہ شوخی صبا ہی اور ہو گئی

نجانے دشمنوں کی کون بات بار آگئی
بسوں تک آتے آتے بد دعا ہی اور ہو گئی

یہ میرے ہاتھ کی لکیریں کھل رہی تھیں یا کہ خود
شگن کی رات خوشبو سے فنا ہی اور ہو گئی

ذرا سی کرگسوں کو آب و دانہ کی جوشہ ملی
عقاب سے خطاب کی ادا ہی اور ہو گئی

سحاب نہیں بھتی تو وہ بھی صبا مثناں ہی تھا
کسی کے واسطے رکت ذرا محال ہی تھا

ہزار آئینے جس جا ہوں روکشِ خورشید
نگاہ بھر کے اُسے دینا کمال ہی تھا

یہ کیا کہہنے لگے قصہ سرو کاخِ پریزی
گدائے عشق کے کیسے میں اک سوال ہی تھا

پچھڑ کے وہ مجھے لوٹا گیا ہے میرا وجود
یہ سانچہ مرے حق میں تو نیک فال ہی تھا

پرند اپنی رضا سے زمین پر اُترا
وگر نہ ایسی ہوا کھتی نہ ایسا جال ہی تھا

ہر ارکھا مجھے جس نے بہ وصفِ چارہ گراں
وہ معجزہ مرا اندوہ اندمال ہی کھتا

قید میں گزرے گی جو عمر بڑے کام کی بھتی
 پر میں کیا کرتی کہ زنجیر تیرے نام کی بھتی

جس کے ماتھے پہ مرے بخت کا تارہ چمکا
 چاند کے ڈوبنے کی بات اسی شام کی بھتی

میں نے ہاتھوں کو ہی پتوار بسنا یا ورنہ
 ایک ٹوٹی ہوئی کشتی مرے کس کام کی بھتی

وہ کہانی کہ ابھی سوئیاں نکلی بھی نہ بھتیں
 فکر ہر شخص کو شہزادی کے انجم کی بھتی

یہ ہوا کیسے اڑا لے گئی آنچل میرا
یوں ستانے کی تو عادت مرے گھنٹام کی تھی

بوجھ اٹھائے بوئے پھرتی ہے ہمارا اب تک
اے زمیں ماں! تری یہ عمر تو آرام کی تھی

پلکیں نہ جھپکنی تھیں کہ گفتارِ عجب تھی
آنکھوں کے لیے ساعتِ دیدارِ عجب تھی

خاموش تھے لب، صوتِ اقرارِ عجب تھی
کیا کہتے صنفالی ہیں کہ سرکارِ عجب تھی

پھر جمنے لگے، دیکھ، مرے پاؤں زمیں پر
غربت میں ترے شہر کی دیوارِ عجب تھی

امکانِ بہاراں سے بھی دل کٹنے لگا تھا
اور برگِ تمنا کی بھی کچھ دھارِ عجب تھی

صحرا میں پیٹ کے میں کسے دیکھتی لیکن
آواز سی اک زمزمہ آثارِ عجب تھی

جھکتی ہی گئی زعم میں دیوار کے اس پار
تقدیر تری شاخِ ثمر وار عجب تھی

اک لمحہ پراں کی بھی قیمت نہیں چھوٹی
یہ سلطنتِ درہم و دینار عجب تھی!

دستار کے بل گن کے جہاں طہی ہو عزت
اس شہر میں توقیر سخن کار عجب تھی!

ہوا نژاد اور آج ہے گوشہ گیر ایسا
رگِ گلو میں ہوا ہے پیوست تیر ایسا

نہ آپ کھلتا نہ میرا احوال پوچھتا ہے
رہِ وفا میں یہ مل گیا کون میرا ایسا

بندھے ہوئے ہاتھ کا بھی اس کو ملال کب ہے
شریکِ پرواز کر رہا ہے اسیر ایسا

نہ مٹ سکے گا، کوئی مرے شیشہ گرسے کہے
جو فاصلہ پڑ گیا دلوں میں لکیں ایسا

میں دونوں ہاتھوں کو چھوڑ کر چل رہی ہوں پھر سے
میرا رادہ کھڑا ہے اک دستگیر ایسا

چٹان چھوڑ کے شاہیں سر نہ سال آیا
کہ عمر بھر کی ریاضت پہ خاک ڈال آیا

سگانِ راہ و طفلانِ شہر کی کرتے
فقیہِ وقت تو دستار خود اچھال آیا

ستارہ پہلے کبھی اس قدر نہ تھا روشن
یہ کون ہاتھ مرے بخت کو اُجال آیا

زمانے نے جسے بے تیشہ کر دیا تھا کبھی
پھاڑ کاٹ کر خود راستہ نکال آیا

یہی نہیں کہ مجھے اس نے تمام رکھا ہے
مرا خیال بھی اس کو کبھی سنبھال آیا

ستارہ داں! تو مرا زانچہ دوبارہ دیکھ
ترے کسے میں نہ آیا، عجیب سال آیا

یہ کس کا سامنا کرنے سے حوت لڑاں میں
سخن شناسوں میں یہ کون باکمال آیا

کفِ گلاب سے خوشبو ہی چُن سکا تو بہت
جو میرے گھر میں ہمیشہ ہوا مثال آیا

کوئی ستارہ مرے ساتھ ساتھ چلنے لگا
سفر میں جیسے ہی مجھ کو ترا خیال آیا

بھاؤ تیز تھا طوفانِ ابرو باد بھی تھا
فصیلِ شہر کو دریا سے کچھ عس ادھی تھا

غبار ہونے سے پہلے ہوا کو یاد بھی تھا
سوا در سنگ میں اک آئینہ نژاد بھی تھا

ہزار بار ہوتی بند جس پہ شہرِ پناہ
سنا گیا ہے کہ وہ شخص شہر زاد بھی تھا

جو بے نیاز ستائش بنا رہا تھا مجھے
اسی کے ہاتھ میں دیکھا تو نگ ادھی تھا

ہزار ٹکڑوں میں بٹ کر بھی اس کا عکس رہی
میں آئینہ تھی، بکھرنے پہ اعتماد بھی تھا

اک ایسے گھر کا ٹھہرنا تو معجزہ سمجھیں
جو بے ستون بھی تھا اور کج نسا د بھی تھا

وہ باکمال کہ اتم عشق جس پہ ہوا
بنامِ حُسنِ اسے حقِ اجہتاد بھی تھا

قفا نے مرے نام کی لوح بھر دی
مری جان ! تو نے بہت دیر کر دی

زمین کرۂ زمہ سیری میں آئی
قفا میں ہے پت جھڑ سے پہلے کی سردی

قفس کی تو خود تیلیاں مڑ گئی ہیں
پرندے کو کس نے نویدِ سفر دی

یہ کیسے شکاری نے جکڑا ہے مجھ کو
کہ خود میں نے اڑنے کی خواہش کتر دی

ہوائے زمستاں نے کیا گل بھلائے
دمِ داپسین شاخ کی گود بھر دی

اسی سے طلبِ حرفِ آخر کی رکھوں
 وہی جس نے توفیقِ عرضِ مہنہ ردی

ہوا کی طرح سے نہیں اختیاری
 کسی بے ٹھکانہ کی آوارہ گردی

مجہت کی تاریخ میں کب نئی ہے
 کسی آبلہ پا کی صحراوردی

حسابِ عداوت بھی ہوتا رہے گا
 مجہت نے جینے کی مہلت اگر دی

میں پھر خاک کو خاک پر چھوڑ آئی
 رضائے الہی کی تکمیل کر دی

شام! میں توری گیاں چراؤں!

آنکھ جب آئینے سے ہٹائی
شام سندر سے رادھا مل آئی
آٹے سپنوں میں گوگل کئے آج
دینے سکھیوں کو آئی بدھاٹی
پریم حل خوب گاگر میں بھروں
آج بادل نے مایا لٹائی
کس کو نکپٹ پہ جانے کی ضد تھی
کس سے گاگر نے بنتی کرائی

ادک سے پانی بہنے لگا تو !
 پیاس گردھر کی کیسے بھجائی
 اب تو جل کا ہی آنچل بنا لوں
 پیڑ پر کیوں چُزیا سکھائی
 اس ہی بالک سے ندیا ملے گی
 جس نے ماتھے کی بندیا چرائی
 رنگ ڈالی مری آتما تک
 کیا منوہر کے من میں سمائی
 میں نے سکھیوں کو کب کچھ بتایا
 پیری پائل نے ہی حساب لگائی
 گوہروں سے بھی کھیلیں کنہیا
 اور ہم سے بھی میٹھی لڑائی
 کوئی خوشبو تو اچھی لگے گی
 پھول بھر بھر کے آنچل میں لائی

شام! میں توری گیاں چراؤں

مول لے لے تو میری کماٹی

کرشن گوپال رستہ ہی بھولے

رادھا پیاری تو سُدھ بھول آئی

سارے سُمر ایک مُرلی کی دُھن میں

ایسی رچنا بھلا کس نے گائی

کیسا بندھن بندھا شام موئے

بات تیری سبھ میں نہ آئی

ہاتھ پھولوں سے پہلے بنے تھے

یا کہ گجرے سے پھوٹی کلائی!

شب وہی لیکن ستارہ اور ہے
اب سفر کا استعارہ اور ہے

ایک مٹھی ریت میں کیسے تھے
اس سمندر کا کنارہ اور ہے

موج کے مڑنے میں کتنی دیر ہے
ناؤ ڈالی اور دھارا اور ہے

جنگ کا ہتھیار طے کچھ اور تھا
تیر سینے میں اتارا اور ہے

متن میں تو جرم ثابت ہے مگر

حاشیہ سائے کا سارا اور ہے

ساتھ تو میرا زمیں دیتی مگر

آسماں کا ہی اشارہ اور ہے

دُھوپ میں دیوار ہی کام آئے گی

تیز بارش کا سہارا اور ہے

ہارنے میں اک انا کی بات بھتی

جیت جانے میں خسارہ اور ہے

سکھ کے موسم انگلیوں پر گن لیے

فصلِ غنم کا گوشوارہ اور ہے

دیر سے پلکیں نہیں جھپکیں مری

پیشِ جاں اب کے نظارہ اور ہے

اور کچھ پل اس کا رستہ دیکھ لوں

آسماں پر ایک تارہ اور ہے

حد چراعون کی یہاں سے ختم ہے

آج سے رستہ ہمارا اور ہے

اس کی ثنا میں حدِ بیاں سے نکل چکا
دل کا یہ حال ہے تو بیاں سے نکل چکا

اک حرفِ تلخ میری زباں سے نکل چکا
کیا عذر ہو کہ تیر کجماں سے نکل چکا

بانٹی تھی جس نے عام معافی کی خود نوید
وہ راتوں رات شہراں سے نکل چکا

اب زندگی چراغِ بکف آئی بھی تو کیا
اک آدمی تو اپنے مکاں سے نکل چکا

آنکھوں نے بھی یہ جان لیا ہے کہ کوئی شخص
اک خواب تھا کہ عرشہ جاں سے نکل چکا

چھڑانا سہل ہو گیا ہے ہات درمیان میں
خدا کا شکر پڑ رہی تھی رات درمیان میں

عجب بساط ہے کہ جتنے کا ذکر ہی نہیں
فریقِ دونوں چاہتے ہیں مات درمیان میں

اشارہ کوچ کا تو ہو چکا ہے دیر سے مگر
بچھا رکھی ہے زندگی نے گھات درمیان میں

فصیلِ شوق پر کمند ڈالنا تو کچھ نہ تھا
مگر کہ پڑ رہا تھا شہرِ ذات درمیان میں

کھلا یہ بید گفتگو کہ حاصل سخن رہی

دہی، جو کٹ رہی تھی ایک بات درمیان میں

ابھی ترسات قحط اور سات بارشیں بھی ہیں

یہ کون مانگنے لگا نجات درمیان میں

بادباں کھلنے سے پہلے کا اشارہ دیکھنا
میں سمندر دیکھتی ہوں، تم کنارہ دیکھنا

یوں بچھڑنا بھی بہت آساں نہ تھا اس سے مگر
جاتے جاتے اس کا وہ مڑ کر دوبارہ دیکھنا!

کس شب بہت کو لیے آیا ہے دروازے پہ چاند
اے شبِ ہجراں! ذرا اپنا ستارہ دیکھنا

کیا قیامت ہے کہ جن کے نام پر پسا ہوئے
ان ہی لوگوں کو مقابل میں صفت آرا دیکھنا

جب بنا مِ دل گواہی سر کی مانگی جائے گی
خون میں ڈوبا ہوا پرچم ہمارا دیکھنا

جیتنے میں بھی جہاں جی کا زیاں پہلے سے ہے
ایسی بازی مارنے میں کیسا خسارہ دیکھنا

آنکھ کی آنکھ ہی کچھ کم نہ تھی میرے لیے
جانے اب کیا کیا دکھائے گا تمہارا دیکھنا

ایک مشتِ خاک اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے
زندگی کی بے بسی کا استعارہ دیکھنا

کیسا ثبات ہے نہ روانی بھی ساتھ ہے
واپس ہیں اور ناؤ میں پانی بھی ساتھ ہے

آسید کون سا ہے تعاقب میں شہر کے
گھر بن رہے ہیں، نقل مکانی بھی ساتھ ہے

یونہی نہیں بہار کا جھونکا کھبلا لگا
تازہ ہوا کے، یاد پرانی بھی ساتھ ہے

ہر قصہ گو نے دیدہ بے خواب سے کہا
اک نیند لانے والی کہانی بھی ساتھ ہے

ہجرت کا اعتبار کہاں ہو سکے کہ جب
چھوڑی ہوتی جگہ کی نشانی بھی ساتھ ہے

گو اسی کیسے ٹوٹی، معاملہ خدا کا تھا
مرا اور اس کا رابطہ تو ہاتھ اور دعا کا تھا

گلاب قیمتِ شگفتِ شام تک چکا کے
وہ دھوپ کو ادا ہوا جو قرض کر صبا کا تھا

بکھر گیا ہے پھول تو ہمیں سے پوچھ گچھ ہوئی
حساب باغبان سے ہے، کیا دھرا ہوا کا تھا

لموچشیدہ ہاتھ اس نے چوم کر دکھا دیا
جزا وہاں ملی جہاں کہ مرحلہ سزا کا تھا

جو بارشوں سے قبل اپنا رزق گھر میں بھر چکا
وہ شہِ مور سے نہ تھا پر دور ہیں بلا کا بھت

بُجھ گئی آنکھ تو پیراہن تر کیا لانا
چاہ سے اب مرے یوسف کی خبر کیا لانا

جب مسافر کا ارادہ ہی بھٹکنے کا ہوا
اک چراغ اور سر راہ گزر کیا لانا

رات ہم خانہ خرابوں کا بھرم رکھ لیتی
روشنی رہتے میں مہمان کو گھر کیا لانا

شب گزار وادہ ستارہ تو مرادوب چکا
اب دم صبح دعاؤں میں اثر کیا لانا

اک دیا بچھ ہی گیا ہوگا سہرطاقِ اُمید
دردِ پینام ہواؤں کو ادھر کیا لانا

شہر میں سانپ جب انسانوں سے اید ہو جائیں
پیشِ آئینہ کوئی ذہن میں ڈر گیا لانا

اتنی ہمت ہے کہ میں مشک میں پانی بھروں؟
فاصلہ کم ہو تو پھر زادِ سفر کیا لانا!

شگون

سات سہاگینس اور میری پیشانی !
 صندوق کی تحسیر
 بھلا پتھر کے لکھے کو کیا دھوئے گی
 بس اتنا ہے
 جذبے کی پوری نیکی سے
 سب نے اپنے اپنے خدا کا اسم مجھے دے ڈالا ہے
 اور یہ سننے میں آیا ہے
 شام ڈھلے، جنگل کے سفر میں
 اسم بہت کام آتے ہیں

تو نے کبھی سوچا

گلہ کم گوئی کا مجھ سے بجا ہے

لیکن اے جان سخن!

تو نے کبھی سوچا

کہ تیری سمت جب میں آنکھ بھر کر دیکھتی ہوں تو

مری ہلکی سنہری جلد کے نیچے

اچانک

اتنے ڈھیروں ننھے ننھے سے دیے کیوں جلنے لگتے ہیں؟

بلاوا

میں نے ساری عمر
 کسی مندر میں قدم نہیں رکھا ،
 لیکن جب سے
 تیری دعا میں
 میرا نام شریک ہوا ہے ،
 تیرے ہونٹوں کی جنبش پر
 میرے اندر کی داسی کے اُجلے تن میں
 گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں !

محبت آشنا

میں تجھ سے مل کے جو نہی باہر آئی
مارچ کی تیکھی ہوا،

بچپن کے ساکھی کی طرح سے،
رنگ کی پچکاریاں تھامے کھڑی تھی،
قبل اس کے

میں ہوا کی مسکراہٹ کو سمجھ پاتی،

مری پیاری سہیلی

رنگ میں مجھ کو جگوتی، کھلکھلاتی، ناچتی،

پل بھر میں اوجھل ہو چکی تھی،

اور پل بھر میں ہی

میرے جاگتے تن پر

دھنک کی اتنی تو سیس بن چکی تھیں

تج جتنی بار مجھ کو دیکھ کر تو مسکرایا تھا!

اس

بہت پیار سے
بعد مدت کے
جب سے کسی شخص نے چاند کہہ کر بلایا ہے،
تب سے

اندھیروں کی خوگرنگا ہوں کو
ہر روشنی اچھی لگنے لگی ہے!

جمالِ ہم نشین.....

ترے آئینہ فن میں

سرا پا دیکھ کر اپنا

بہت حیران ہوں

اور بار بار پلکیں جھپکتی ہوں کہ یہ میں ہوں

(کہ کوئی اور لڑکی ہے!)

مری آنکھوں میں پہلے بھی شرارت تھی

مگر اب تو تارے کھلا کھلاتے ہیں!

مے لب اس سے پہلے بھی تبسم آشنا تھے

لیکن اب تو بے ضرورت مسکراتے ہیں !
غرور ایسا کہاں کا آگیا دھیے مزاجوں میں
کہ دن میں بھی اڑھی پھرتی ہوں خوابوں کی ہواؤں میں
مرے بچے میں ایسی نرم فامی کب سے در آئی
کہ جس سے بات کرتی ہوں
سعادت پھول چنتی ہے
ہنسی میں اُس کھنک کی گونج ہے
جس سے محبت گیت بنتی ہے ،
اور ان سب سے سوا
دل کی گدازی ،
جو مجھ کم ظرف کو شائستہ مضبوط الم کر دے
کے دشمن کی بھی انگلی تو میری آنکھ نم کر دے
سکھائے چشم پوشی
دوست کا پردہ رکھے

خلوصِ ہم و ہاں کو شک کی آنکھوں سے ہمیشہ دیکھنا ہی ترک کر دے
 لو کہ اعترافِ عشق پر ایمان لانے کی بصیرت دے ،
 مجھے گو تم کے ہر اُپدیش، عیسیٰ کے ہر اک سرمن کا بین السطر بھادے !

میں اُس کی خوش گماں آنکھوں سے

دنیا دیکھتی ہوں ،

مسکرا کر سوچتی ہوں ،

زمین یک لخت کتنی خوبصورت ہو گئی ہے !

کس شہر میں لائی خوش کلامی
دل شہر بی و رفیق شامی

اک عمر سے زندگی کا معمول
تنہائی ہے اور خود کلامی

دریا بھی جو میری رہنما ہو
تقدیر سفر ہے تشنہ کامی

کچھ رستے ہیں عشق کے، جہاں پر
آتی نہیں کام تیسرا کامی

سب فیض اسی تبفق لظنہ کا
کیا چیز ہے میری لالہ نامی

جو اپنے کمال کی جزا لے
کس کام کی ایسی نیک نامی

سب عشق کریں گے اور سچا
ہے اپنے قبیلے میں یہ حسامی

جس جاں کی رسیاں ہوں ڈھیلی
کیا سمجھے گا میری زہرا می

ننھا سا پرند شاخ گل پر
ہے ابر بہار کا پیامی

رنگوں کو تو چین دیا لظنہ میں
خوشبو کی زمام کس نے مہت نامی

جذبات ہی کسند ہیں تو بے کار
توار کی لاکھ بے نیامی

آنکھوں سے رواں ہے جئے نونوں پر
پہلی سی نہیں سبک حسد امی

یہ رسم تو میر سے چلی ہے
دل والوں کو درد کی سلامی

ہم بے ہنروں کی زیت پالی بھر
اقبال کی زندگی ، دوامی

نئی آنکھ کا پُرانا خواب

آتش دان کے پاس
 گلابی حدت کے ہالے میں سمٹ کر
 تجھ سے باتیں کرتے ہوئے
 کبھی کبھی تو ایسا لگا ہے
 جیسے اوس میں بھگی گھاس پہ
 اُس کے بازو تھامے ہوئے
 میں پھر نیند میں چلنے لگی ہوں !

گونج

اُونچے پہاڑوں میں گم ہوتی پگڈنڈی پر
کھڑا ہوا ننھا چرواہا
بکری کے بچے کو پھلتے دیکھ کے
کچھ اس طرح ہنسا ہے
وادی کی ہر درز سے جھرنے پھوٹ رہے ہیں!

خاکم بدین

سرکار!

ہم تو آپ کے ایماں نثار تھے

ہر مقتلِ جفا میں لہو کے شریک تھے
کم پوشیِ قبا میں رفو کے شریک تھے
دل آپ کا دکھا ہے تو آنسو ادھر بہے
چوٹ آپ کو لگی تھی مگر نیل کب پڑے
اپنی ہی سمت کھنچا ہوا تیر ہم بھی تھے
اپنے خلاف لی ہوئی تعزیر ہم بھی تھے

لیکن یہ سیکھ بہت تھا کہ کچھ معتبر تو ہیں
منزل نہیں ہیں آپ کی گرو سفر تو ہیں
یہ کیا کیا کہ گرو سفر بھی نہ اٹھ سکے
چشمِ خطا سے بارِ نظر بھی نہ اٹھ سکے
اب تک تو شہرِ جاں پہ عذاب آئے تھے مگر
اب کے تو اعتبار کی دنیا جسٹری گئی
ماٹھے پہ بل نہ آئے دیا تھا کبھی تھپہ
بھجے ہیں تنی گہری شکن کیسے پر گئی؟

بدن کے موسمِ پے اختیاری میں

کوئی دن زندگی میں ایسا آئے
 تو میرے دھیان میں کھو کر
 رموزِ شہریاری بھول جائے
 میں اس شدت سے یاد آؤں
 شکوہ کج کلا ہی بھول جائے
 مرے بھی سارے رشتے، سارے ناتے
 خود فراموشی بہالے جائے
 کل دنیا سمٹ کر تیری باہوں میں سما جائے

بدن کے موسم بے اختیاری میں

کسی پل —

فصیل شہر سے باہر

حصار چادر و دستار کی حد سے نکل کر

ایک لمحے کو — بس اک لمحے کو

ہم اپنے مقدر آزما میں —

شب ممنوع سے اک پل چُرا لیں !

تاوان ،

گُلِ انار کی ہلکی گلابی چھاؤں میں بیٹھ کے
کافی بنانا

مجھے بھی اچھا لگتا ہے

لیکن ایسا کرتے ہوئے

میری جھکی ہوئی پلکیں

تجھ سے جو رنگ چھپاتی ہیں

وہ اس چھاؤں کے رنگ سے بڑھ کر گہرا ہے!

پذیرائی

ابھی میں نے دہلیز پر پاؤں رکھا ہی تھا — کہ
کسی نے مرے سر پہ پھولوں بھرا تھا اُلٹا دیا —

میرے بالوں پہ، آنکھوں پہ، پلکوں پہ، ہونٹوں پہ،

ماٹھے پہ، رخسار پر

پھول ہی پھول تھے

دو بہت مسکراتے ہوئے ہونٹ

میرے بدن پر محبت کی گلزار مہروں کو یوں ثبت کرتے چلے جا رہے تھے

کہ جیسے ابد تک

مری ایک اک پور کا انتساب

اپنی زیبائی کے نام لے کر رہیں گے

مجھے اپنے اندر سمو کر رہیں گے

نیک

صبح وصال کی پو پھٹتی ہے

چاروں اُور،

مدھ ماتی بھور کی نیلی ٹھنڈک پھیل رہی ہے

شگن کا پہلا پرند

منڈیر پر آکر

ابھی ابھی بیٹھا ہے

سبز کواڑوں کے پیچھے اک سرخ کلی مسکائی

پازیبوں کی گونج فضا میں لہرائی

کچے رنگوں کی ساری میں

گیلے بال چھپائے گوری

گھر کا سارا باجرہ آنگن میں لے آئی!

بے پناہی

کسی اور کے بازوؤں میں سمٹ کر
تجھے سوچنا

کس قدر منفرد تجربہ تھا!

یہ احساس ہی کس قدر جان لیوا ہے جاناں!

کہ ایسی جگہ، اس خنک زار میں

میرے تن پر پھسلتی ہوئی شبنمی حدیثیں

تیری لذت فشاں انگلیوں سے اگر چھوٹتیں

تو مرے جسم کی ایک اک پوزن ب کس طرح جھگمکاتی

ترے روشنی آشنا لہجے

کیسے بھٹکتے،

اور اب سرخوشی کی اُس اک آخری یاد رہ جانے والی گھڑی میں...

وقت کی نا سمجھ رو ہے

اور بے بسی کی نئی لہر ہے،

زمتاں کی اس آخری شام میں

اور مرے جسم میں

شاید اب کوئی بھی فرق باقی نہیں،

میرا سا لہتی مری بند آنکھوں کو کس پیار سے چوم کر کہہ رہا ہے

ارے۔ آج تو برفت باری ابھی سے ہی ہونے لگی

جان!۔ اُد مجھے اور ڈھیلو!

اُسے کیا خبر ہے

کہ اس وقت میں آگ بھی اڑھٹوں تو

مری رُوح پر ہونے والی کوئی برفباری

نہیں رُک سکے گی!

شامِ غریباں

غنیم کی سرحدوں کے اندر
زمینِ نامہرباں پہ جنگل کے پاس ہی
شامِ پڑ چکی ہے
ہوا میں کچے گلاب جلنے کی کیفیت ہے
اور ان شگوفوں کی سبز خوشبو
جو اپنی نوخیزیوں کی پہلی رتوں میں
رعنائیِ صلیبِ خزاں بنے
اور بہار کی جاگتی علامت ہوئے ابد تک!
جلے ہوئے راکھِ خمیوں سے کچھ کھلے ہوئے سر
ردائےِ عفتِ اڑھانے والے بریدہ بازو کو ڈھونڈتے ہیں
بریدہ بازو۔ کہ جن کا مشکیزہ

نہنے حلقوم تک اگرچہ پہنچ نہ پایا
مگر وفا کی سبیل بن کر فضا سے اب تک چھلکا ہا ہے
برہنہ سر سبز بیاں

ہواؤں میں سوکھے پتوں کی سرسراہٹ پہ
چونک اٹھتی ہیں

بادِ صرصر کے ہاتھ سے پنپنے والے پھولوں کو چومتی ہیں
چھپانے لگتی ہیں اپنے اندر

بدلتے، سفاک موسموں کی ادا شناسی نے

چشمِ حیرت کو سہم ناک کی کا مستقل رنگ دے دیا ہے،
رگاہِ تخیل دیکھتی ہے

چمکتے نیزوں پہ سارے پیاروں کے سر سجے ہیں،
کئے ہوئے سر

شکستہ خوابوں سے کیسا پیمان لے رہے ہیں

کہ خالی آنکھوں میں روشنی آتی جا رہی ہے!

ادرنی

نیمہ بے گناہی سے میں
شہر انصاف کی سمت جو نہی بڑھی،
اپنی اپنی کمیں گاہ سے
میرے قاتل بھی نکلے
کمانیں کسے، تیر جوڑے، طمنچے پڑھائے،
مجانوں پہ ناوک بدستوں کو تیار رہنے کے احکام دیتے ہوئے،
شاہراہوں میں پیاسی سنانیں لیے فتنہ گر صف بہ صف
چوک پر قاضی شہر خنجر بکھن
راستے دشنہ در آتیں
گھات میں شہر کا ہر مکیں
میرے تنہا کجاوے کی آہٹ کو سنتے ہوئے
عکبوتی ہنر میرے چاروں طرف جال بنتے ہوئے

کوئی میرے علم کا طلبگار
 کوئی مرے سر کا خواہاں
 تو کوئی ردا کا تمنائی بن کر
 جھپٹنے کو ہے :

حلقہ دشمنان تنگ ہونے کو ہے
 موت سے آخری جنگ ہونے کو ہے
 کو ذر عشق میں
 میری بے چارگی

اپنے بالوں سے چہرہ چھپائے ہوئے
 ہاتھ باندھے ہوئے
 سر جھکائے ہوئے
 زیر لب ایک ہی اسم پڑھتی ہوئی —
 یا غفور الرحیم
 یا غفور الرحیم

تعمیر

سواب پر شرطِ حیات ٹھہری
کہ شہر کے سب نجیب افراد
اپنے اپنے لہو کی حرمت سے منحرف ہو کے جینا سیکھیں،
وہ سب عقیدے کہ ان گھرانوں میں
ان کی آنکھوں کی رنگتوں کی طرح تسلسل سے چل رہے تھے
سنا ہے باطل قرار پائے،
وہ سب وفاداریاں کہ جن پر لہو کے وعدے حلف ہوئے تھے
وہ آج سے مصلحت کی گھڑیاں شمار ہوں گی
بدن کی وابستگی کا کیا ذکر
روح کے عہد نامے تک فسخ مانے جائیں!

نموشی و مصلحت پسندی میں خیریت ہے

مگر مے شہر منحرف ہیں

ابھی کچھ ایسے غیور و صادق بقید جاں ہیں

کہ حرف انکار جن کی قیمت نہیں بنا ہے

سو حاکم شہر جب بھی اپنے غلام زادے

انہیں گرفتار کرنے بھیجے

تو ساتھ میں ایک ایک کا شجرہ نسب بھی روانہ کرنا

اور ان کے ہمراہ سرد پتھر میں چننے دینا

کہ آج سے جب ،

ہزار ہا سال بعد ہم بھی ،

کسی زمانے کے ٹیکسلا یا ہٹریہ بن کر تلاشے جائیں

تو اس زمانے کے لوگ

ہم کو

کہیں بہت کم نسب نہ جائیں !

گنگا سے

جگ بیٹے

دجلہ سے اک بھٹکی ہوئی لہر

جب تیرے پوتر چروں کو چھونے آئی تو

تیری ممتا نے اپنی باہیں پھیلا دیں

اور تیرے ہرے کناروں پر تپ

اناس اور کٹھل کے جھنڈ میں گھرے ہوئے

کھیر ملیوں والے گھروں کے آنگن میں کلکاریاں گونجیں

میرے پرکھوں کی کھیستی شاداب ہوئی

اور شگن کے تیل نے دینے کی کو کو اونچا کیا
پھر دیکھتے دیکھتے

پیلے پھولوں اور سنہری دیوں کی جوت
ترے پھولوں والے پل کی قوس سے ہوتی ہوئی
مہران کی اور تک پہنچ گئی،
میں اسی جوت کی ننھی کرن

پھولوں کا تھاال لیے تیرے قدموں میں پھرا بیٹھی ہوں
اور تجھ سے اب بس لیک دیا کی طالب ہوں
یوں انت سے تک تیری جوانی سنستی رہے،

پر یہ شاداب منہسی

کبھی تیرے کناروں کے لب سے

اتنی نہ چھلک جائے

کہ میری بستیاں ڈوبنے لگ جائیں

گنگا پیار می !

یہ جان

کہ میرے روپے راوی اور بھورے مہران کی گیلی مٹھی میں

مری ماں کی جان چھپی ہے

مری ماں کی جان نہ لینا

مجھ سے مرا مان نہ لینا

تاج محل

سنگِ مرمر کی خاکِ باہوں میں
 حنِ نوا بیدہ کے آگے مری آنکھیں شل ہیں
 گنگ صدیوں کے تناظر میں کوئی بولتا ہے
 وقت جذبے کے ترازو پہ زرد سیم و جواہر کی تڑپ تو لتا ہے!
 ہر نئے چاند پہ پتھر وہی سچ کہتے ہیں
 اسی لمحے سے دمک اٹھتے ہیں ان کے چہرے
 جس کی کو، عمر گئے، اک دلِ شب زاد کو متاب بنا آئی کھتی
 اسی متاب کی اک نرم کرن

سانچہ سنگ میں ڈھل پائی تو
عشق رنگِ ابدیت سے سرفراز ہوا

کیا عجب نیند ہے
جس کو چھو کر
جو بھی آتا ہے کھلی آنکھ لیے آتا ہے
سوچے خوابِ ابد دیکھنے والے کب کے
اور زمانہ ہے کہ اس خواب کی تعبیر لیے جاگ رہا ہے
اب تک.

اے جگ کے رنگ ریز

اے جگ کے رنگ ریز!
 مری بھی اوڑھنی رنگ دے
 میں پنکھٹ پر کیسے جاؤں
 بھیگے پلو سے ماتھوں کو بچاتی سکھیاں
 مجھ پر سنہتی ہیں!
 میں نے سو سو جنن کیے
 پر مجھ پر روپ نہ آیا
 کیسے ہنکھڑی، سنا کے پتے، ہارسنٹھار کا ڈنٹھل
 اور کسٹم کے پھول

سب آنچل میں بندھے رہ گئے

کوئی مرے کام نہ آیا
گھنٹے پاتے گئے اکارت

پتی کا پیار بھی مری کا یا بدل نہ پایا

رہی مری چٹری پھسکی کی پھسکی !

ہاں — بس اک رت ایسی آئی تھی

جب مجھ پر ہر مایلی ٹوٹ کے چھائی تھی

تن کے سندھ بن میں ساتوں رنگ کے پھول کھل اٹھے تھے !

لیکن پہلی ہی بارش میں

جل گئے سارے پھول

ایک ذرا سی دھوپ ہوئی

اور پل بھر میں سب دھول

دھوپ کڑی تھی یا پھر رنگ ہی کچھے تھے —

اب تک جان نہ پائی ،

بس اتنا بھر دیکھ سکی ہوں

اے جگ کے رنگ ریز!

ترمی مٹھی میں دھنک ہے

بادل، جل، آکاش، چندرما، مکمل، چنبیلی، دُوب

اُودا، اُجلا، نیلا، پیلا، سرخ، روپہلا، سبز

اتنے سارے رنگوں میں

مے نام کا کوئی رنگ تو ہوگا

خسر و مرشد!

اپنے ہاتھ سے میرے تن پر مل دے

اور جو تجھے یہ بھی نہ سہائے

مجھے اپنے رنگ میں رنگ لے!

— تو برمن بلا شندی

کچے ذہن اور کچی عمر کی لڑکیاں

اپنی خوبی میں

مانع جیسی ہوتی ہیں

جس برتن میں ڈالی جائیں

اُسی شکل میں کیسے مزے سے ڈھل جاتی ہیں!

کیسا چھانکنا، کیسا اُبلنا اور کہاں کا اُڑنا!

اور اک میں ہوں — پتھر اور شوریدہ مزاج!

کاسہ خالی میں بے وجہ سما جانے کی بجائے

اُس سے اس قوت سے ٹکرانا چاہوں کہ

ظرفِ تہی کی گونج سے اُس کا بھرم کھل جائے!

میں نے آئینے کو کب جھٹلایا ہے !
 ماں — گھنے مجھ پر بھی اچھے لگتے ہیں ،
 لیکن جب بھی مجھ کو ان کا منہ کبھی یاد آتا ہے تو
 کنگن بچھو بن جاتے ہیں
 اور پازرہیں ناگ کی صورت میرے پاؤں جکڑ لیتی ہیں !
 بہت ہی میٹھے بولوں کا جزو اعظم
 جب حالتِ خام میں مجھ کو نظر آ جاتا ہے
 دہشت سے مری آنکھیں پھیلنے لگتی ہیں
 اور اس خوف سے میری ریڑھ کی ہڈی جمنے لگتی ہے د
 ان ہی مادر زاد منافق لوگوں میں
 مجھ کو ساری عمر بسر کرنی ہے !

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے
 میں نے اپنا ہاتھ اچانک کسی اور کے ہاتھ میں پایا

لیکن جلد ہی، میری ضرورت سے زاید بے رحم بصارت نے یہ دیکھ لیا ہے
یا تو میرے ساتھی کی پرچھائیں نہیں بنتی ہے

یا پھر مٹی پر

اُس کے پنچے اُس کی ایڑی سے پہلے بن جاتے ہیں
انسانوں کی سایہ رکھنے والی نسل ناپید ہوتی جاتی ہے!
شام کے ڈھل جانے کے بعد

جب سایہ اور سایہ کناں دونوں بے معنی ہو جاتے ہیں
میں مکروہ ارادوں والی آنکھوں میں گھر جاتی ہوں

اور اپنی چادر پر تازہ دھتے بنتے دیکھتی ہوں
کیونکہ مجھ کو ایک ہزار راتوں تک چلنے والی کہانی کہنا
نہیں آتی

میں — آقائے ولی نعمت کو

خود اپنی مرضی بھی بتانا چاہتی ہوں!

کنیادان

بال صندل کے پانی میں بھیکے ہوئے
 جسم چندن کے مس سے دکھتا ہوا
 آنکھ خواہوں کی افشاں سے بوجھل بہت
 ہونٹ پر ان کہی کا مزہ !

گوری گوری کلائی سے لپٹی ہوئی موتیے کی لڑی
 سرخ زرتار جوڑے میں سمٹی ہوئی ایک کچی کلی
 گاہے گاہے جھلکتی ہوئی موہنی شکل وہ — چاندی
 چوڑیوں کی کھنک

اور پائل کی چھن چھن سے چھنتی ہوئی
 کیسی پیاری ہنسی

تس پہ سکیوں کی وہ چھیر کہ
 آٹنے سے بھی نظریں ملانی نہیں جاسکیں !

شامیانے کے پرلی طرف،

وقت کے جبر کے سامنے،

چپ کھڑی مامتا۔

جس کے چاروں طرف

تشنہ ہونٹوں، گرسنہ نگاہوں، لٹکتی زبانوں، بدن گیر

غراہٹوں کا عجب غول ہے

اور اسی غول سے

اپنی نازوں کی پالی کی خاطر

بڑے صبر سے

ایک مجبور ہرنی کی صورت وہ چن لاتی ہے

اک ذرا کم ضرر بھیڑیا!

آتشِ جاں سے قفسِ آپ ہی جل جانا کھتا
 قفلِ زنداں! ترا مقصوم کچل جانا کھتا

جس کو اک نسل نے سینچا تھا لہو سے اپنے
 ال نہ اک روز تو اس پیر کو پھل جانا کھتا

دست سے پہلے کبھی شام نہ یوں آ لیتی
 منہ اندھیرے ہی ہمیں گھر سے نکل جانا کھتا

ہارنے والوں سے سمجھوتا کہاں ممکن تھا
 حرف ملتے بھی تو مفہوم بدل جانا کھتا

کس کو ٹھہرائیں گے میثاقِ محبت میں فریق
ہم نے خود کو بھی ادا دے کا اٹل جانا تھا

اس نے ہی پہلی ہوا میں مراد امن بھتا ما
جس دیے کو کسی نیکی کا بدل جانا تھا

وقت کی اتنی کمیں گاہوں سے ہو آئی ہے
زندگی! اب تو کسی طور سنبھل جانا تھا

وہ تو کیسے کہ کھلی بہ آنکھ رکھی نیند میں بھی
ورنہ ہم شب کا کوئی وار تو چل جانا تھا

فصلِ بروقت نہ کشتی جو پسروں کی پروین
آسمانوں نے زمینوں کو نگل جانا تھا

کسے خبر ہے کہ کیا رنج و غم اٹھاتے ہیں
تراش کر جو زباں کو قلم اٹھاتے ہیں

قرار دادِ محبت تو کب کی فسخ ہوئی
فریق آج یہ کیسی قسم اٹھاتے ہیں

زمین کی پشت تھم سے دوہری ہو جائے
اگر وہ بوجھ اٹھائے جو کھم اٹھاتے ہیں

مثالی دُردِ تیرِ جام ہیں کہ بیٹھ کے بھی
اک اور حشر ہیں جامِ حسم اٹھاتے ہیں

ہمیں بچھانے کو اندر کا جس کافی ہے
ہو مزاجوں کا احسان کم اٹھاتے ہیں

وہاں بھی ہم تو ستارہ سوار تھے کہ جہاں
بہت ہی سوچ سمجھ کے قدم اٹھاتے ہیں

پوسٹ ڈزائیم

آپ کی زلف کے ہم تو پہلے ہی گویا اسیروں میں تھے
 آج تو آپ کے ہاتھ بھی چوم لینے کو جی چاہتا ہے
 کہ آج آپ نے

اتنی انواع و اقسام کی لذتیں میز پر جمع کر دیں
 کہ ہم لوگ حیران تھے سب
 کہاں سے شروعات ہوں

تعجب تو یہ ہے کہ اپنے سماجی فرائض میں اس درجہ مصروف
 رہنے کے باوجود

آپ اتنے گھنٹے کچن میں رہیں

نو کروں کا ہے قحط اور پھر خاص کر کس کی بددماغی کے عالم میں

اتنا بہت کچھ! پھر اتنا مزیدار کھانا پکانا!

ہمیں تو کوئی معجزہ ہی لگا

اس پہ حیران کن بات یہ ہے

کہ اتنی تھکن پہ

جیس اور ساری پہ کوئی شکن تک نہیں

اس ڈنر کے مقابل میں بگم فلاں کا ڈنر کچھ نہ تھا!

شکریہ

اس پسندیدگی کا بہت شکریہ

اب یہ فرمائیں، کیا پیش ہو

چائے، کافی کہ شاعر؟

بنکِ نیم

تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو
 ٹھیک ہی کہتے ہو۔!
 کھیلنے والے سب ہاتھوں کو میں گڑیا ہی لگتی ہوں۔

جو پہنادو، مجھ پہ سچے گا
 میرا کوئی رنگ نہیں
 جس نیچے کے ہاتھ تھما دو
 میری کسی سے جنگ نہیں

سوتی جاگتی آنکھیں میری

جب چاہے بنیائی لے لو

کوک بھرو اور باتیں سن لو

یا میری گویائی لے لو

مانگ بھرو، سینڈر لگاؤ

پیار کرو، آنکھوں میں بساؤ

اور پھر جب دل بھر جائے تو

دل سے اٹھا کے طاق پہ رکھ دو

تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو

ٹھیک ہی کہتے ہو!

بوسے یا سمن باقیست

(نذرِ فراق)

سبز دنوں کا سب سے تندرپیر
 ہوا کے آگے اب بے بس ہے
 پتے اک اک کر کے گرتے جاتے ہیں
 وہی شاخ کہ کبھی دلہن کی طرح پھولوں سے لد کر بھی
 کیسی تنکھی سرشاری سے تنی رہتی تھی
 آج اپنے سب گننے اُتار چکی ہے — پھر کبھی خمیدہ ہے
 وہی ثنا — جو برف کے ہر موسم کے بعد
 ننھی ننھی ہری، ستاروں جیسی کونپلوں سے بھر جاتا تھا،
 آج اُس پر بس چوڑیاں چلتی نظر آتی ہیں،
 وہی شگوفے جن سے لپٹ کر دھویب کبھی مہستی،

تو رنگوں اور کمر فوں کے پھرے گڈ مڈ ہو جاتے،
اُس کی بھی ساری پنکھڑیاں رزقِ ہوا کہلا میں
سبز دَفوں کا سب سے تندر پیر — آخر

اپنی ہر ممکن ہریالی کما چکا
اور اب خاموشی سے اپنے ہونے کی مجبوری کا،
وعدہ معاف گواہ بنا استاد ہے

اور وقت کی اٹل شہادت پر،
اپنے فیصلہ کن لمحے کا رستہ دیکھ رہا ہے
تہنا — اور تہی دامان ا

سبز لباسی گئے جہنم کی بات ہونے
پھر یہ برہنہ شاخوں سے چھین چھین کر،
اتنی ٹھنڈی چھاؤں کہاں سے آتی ہے،
بن پھولوں کے

خوشبو کیسے پھیل رہی ہے؟

ملا ل تیز روی

کتنا عجب ہے یہ راگ من کا
کوئی بھی سُر تو نہیں کومل
ایسی شور مچاتی ہو امیں
کیسے کھلے تن کی کونسل
اور ہر دے کی وہ آنکھ
جو موہ کی رت میں شری سے پہلے جاگا کرتی ہے
وقت کے اتنے تیز بہاؤ میں
تجھ سے من کی رت کچھ ایسے گزرتی ہے

جیسے گھنے جنگل میں سرپٹ دوڑتی ریل کی کھڑکی سے

ہاتھ بڑھا کر

کسی گھنیری شاخ کو تھامنا چاہوں

اور اپنے پھیلے ہوئے ہاتھ پہ

ایک خراش بسالوں

اک انکار کی نیلی لکیر کا

اور اضافہ کر لوں !

ایک سورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اُٹھا
آنکھ حیران ہے کیا شخص زمانے سے اُٹھا

کس سے پوچھوں ترے آقا کا پتہ اسے رحوار
یہ علم وہ ہے نہ اب تک کسی شانے سے اُٹھا

حلقہ خواب کو ہی گردِ گلو کس ڈالا
دستِ قاتل کا بھی احسان نہ دو آنے سے اُٹھا

پھر کوئی عکس شاعروں سے نہ بننے پایا
کیسا متاب مرے آئینہ خانے سے اُٹھا

کیا لکھا تھا مہرِ محضرا جے پہچانتے ہی
پاس بیٹھا ہوا بہر دوست بہانے سے اُٹھا

آج تک شہر کا چہرہ نہیں دھلنے پایا
گرد کا کیسا بگولا ترے جانے سے اٹھا

زندگی میں یہ بدن شعلہ جوالہ تھا
موجہ سرد! مری راکھ ٹھکانے سے اٹھا

ڈھال اب وقت کے ہاتھوں میں ہے اے تیر انداز
رکھ دے اک سمت کمان ہاتھ نشانے سے اٹھا

دل تری چشم مدارات سے بیعت تھا تو پھر
کس طرح بزم میں اُوروں کے اٹھانے سے اٹھا

دُور دیکھ سینہ سوزاں سے بھلا کیا ڈرنا
وہ دُھواں دیکھ جو شعلوں کے بجھانے سے اٹھا

دل دکھا ہے تو کھلی ہے مرے وجدان کی آنکھ
اک شگوفہ تھا کہ شبنم کے جگانے سے اٹھا

سونپ دے اپنا ہنر ان کو کہ جن کا حق ہے
وقت آیا ہے کہ اب سانپ خزانے سے اٹھا

کتاب

یہاں وہ لڑکی سو رہی ہے
 کہ جس کی آنکھوں نے نیند سے خواب بول لے کر
 وصال کی عمر تجگے ہیں گزار دی تھی
 عجیب تھا انتظار اس کا
 کہ جس نے تقدیر کے تنک حوصلہ مہاجن کے ہاتھ
 بس اک، در پچہ نیم باز کے سکھ پہ
 شہر کا شہر رہن کر دیا تھا
 لیکن وہ ایک تارہ

کہ جس کی کروں کے مان پر
چاند سے عرفیہ کشمکش تھی
جب اُس کے ماتھے پہ کھلے والا ہو
تو اُس پل

پسینہ صبح بھی نمودار ہو چکا تھا

فراق کا لمحہ آچکا تھا!